R-N-2/86/53 REGD. NO-L 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت پانچ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
یکم - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷، شمارہ ۳۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

گاندھی جی کو سچّا خراجِ عقیدت کیا ہونا چاہیے؟

۲؍اکتوبر کو گاندھی جی کا جنم دن ہے۔ اب پورے سال گاندھی جی کی یاد میں کوئی نہ کوئی پروگرام ہوگا۔ حکومت ہند کی مدد سے گاندھی سمارک ندھی نے بہت لمبا چوڑا خاکہ بنایا ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں جلسے ہوں گے۔ دنیا کے بہت سے بڑے شہروں میں ابھی سے کمیٹیاں بن گئی ہیں۔ اربوں الفاظ فضا میں بکھیرے جائیں گے۔ شاید ان صفحات کی تعداد جو گاندھی جی کے متعلق چھپیں گے لاکھوں تک پہنچے۔ وہ روپیہ جو ان تقریبات میں خرچ ہوگا وہ بھی لاکھوں میں شمار ہوگا۔

بظاہر یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ گاندھی جی کی یاد ہمارا فرض ہے۔ گاندھی جی کی تعلیمات کی اشاعت ہمارا مشن ہے۔ گاندھی جی ہندوستان کے اور انسانیت کے محسن ہیں۔ اپنے محسن کی یاد، اپنے محسن کے فضائل کا بیان، قوم اور سماج کی اصلاح کے لیے ضروری ہے۔ ہم اپنا راستہ بھول گئے ہیں۔ شاید گاندھی جی کی یاد ہمیں صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے۔

مگر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے ایک بنیادی غلطی ہو رہی ہے ہم گاندھی جی کے متعلق تقریریں کرنے، ان پر کتابیں لکھنے، ان کے مجسمے نصب کرنے، ان کے نام پر شاندار عمارتیں بنانے، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے پر زور دے رہے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو گاندھی جی کی تعلیم کے چھوٹے سے چھوٹے جز کو اپنانے کا دھیان ہی نہیں آتا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ لوگ سچ کو اپنائیں اور عدم تشدد کا راستہ اختیار کریں۔ ہم نے سچ کو چھوڑ دیا ہے سیاست کو اپنا لیا ہے۔ ہم تشدد کو اپنے مسائل کا حل سمجھنے لگے ہیں۔ گاندھی جی تمام انسانوں کو بھائی سمجھتے تھے اور تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ ہم ابھی تک فرقہ واریت کی لعنت سے چھٹکارا نہیں حاصل کر پائے اور مذہب کے نام پر خون بہانے کو ابھی تک تیار ہیں۔ گاندھی جی غریبی، جہالت، تنگ نظری کو مٹانا چاہتے تھے۔ ہم جتنی ترقی کرتے جاتے ہیں اتنے ہی کنگال ہوتے جاتے ہیں۔ جتنا علم حاصل کرتے جاتے ہیں اتنے ہی جاہل اور تنگ نظر ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے سرمایہ دار عوام کی پریشانیوں کو نہیں دیکھتے اپنی تجوریاں بھرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہمارے نیتا اپنی گدی سنبھالنے یا دوسرے کی گدی چھیننے میں لگے رہتے ہیں۔ ہماری سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ غذا کا مسئلہ ہو یا تعلیم کا یا دفاع کا یا قومی یک جہتی کا سب کو گروہ یا پارٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں امریکہ کے حامی اور روس کے ساتھی بہت مل جائیں گے۔ ہندوستان کے وفادار اور ہندوستان کے چاہنے والے کم ملیں گے۔ ہمارے افسر فرعون ہیں، ہمارے کلرک بد دماغ ہیں۔ ہمارے استاد اپنے فرائض سے غافل ہیں اور ہمارے طلبا ساری دنیا سے بیزار اور برہم۔ ہم سب حقوق کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔ فرائض کا ہمیں دھیان نہیں آتا۔ گاندھی جی کو جنوری ۱۹۴۸ء میں ناتھو رام گوڈسے کی گولی نے ایک بار شہید کیا تھا۔ ہم روز گاندھی جی کی تعلیمات کو اپنی غفلت، کاہلی، بے پروائی، بے حسی سے قتل کرتے رہتے ہیں۔ ہماری ساری عقیدت تو الفاظ میں صرف ہو جاتی ہے یا شاندار تقریبوں اور یادگاروں کی تعمیر میں۔ گاندھی جی کی راہ پر چلنے کی توانائی ہم میں کہاں سے آئے۔ نیچے ہم گاندھی جی کی تصانیف کے پانچ اقتباس دے رہے ہیں۔ کاش ہم اپنی طاقت ان پر عمل ہی صرف کرتے تو شاید ساری شاندار تقریبوں اور یادگاروں سے بہتر اور ٹھوس یادگار قائم ہو جاتی۔ مگر ہمیں باتوں سے فرصت کہاں ہے۔

(۱) "میری کوشش یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کروں۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا نہ آسمان پر ہے اور نہ زمین پر بلکہ ہر انسان کے دل کے اندر ہے۔"

(۲) "اگر کوئی شخص اہنسا پر عامل ہو تو یہ ممکن نہیں کہ سماجی بے انصافی کہیں پر دیکھے اور اس کے مقابلے کے لیے نہ اٹھ کھڑا ہو۔"

(۳) "جمہوریت جس میں ضبط و نظم اور روشن خیالی ہو، دنیا میں سب سے اچھی چیز ہے، لیکن وہ جمہوریت جو متعصب، جاہل اور توہم پرست ہو، آخر میں سماجی زندگی کو درہم برہم کر دے گی اور خود اپنے ہاتھوں برباد ہو جائے گی۔"

(۴) "میں نہیں چاہتا کہ میرے مکان کے چاروں طرف اونچی اونچی

دیواریں کھڑی ہوں اور اس کی سب کھڑکیاں بند رہیں۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں، سبھی دیس کی ہوائیں خوب آئیں خوب چلیں مگر میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ ان ہواؤں کے زور سے میرے پاؤں اپنی زمین سے اکھڑ جائیں۔ میری یہی خوشی ہے کہ ہمارے لڑکے لڑکیاں جو علمی ادبی مذاق رکھتے ہیں دل کھول کر انگریزی اور عالمی زبانیں سیکھیں اور پھر اپنے علم سے ہندوستان کو فائدہ پہنچائیں۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ کوئی ہندوستانی اپنی مادری زبان کو بھول جائے یا اس سے غفلت برتے یا اسے اپنی زبان کہتے ہوئے شرمائے یا یہ محسوس کرے کہ وہ اسے بہترین فکر یا اظہار فکر کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔"

(۵) "جو لوگ میری تصاویر وغیرہ بنا کر میری عزت کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اس روپیہ کو میری عین سیوک سنگھ، گرام اُدیوگ، چرخہ سنگھ یا تعلیمی سنگھ کے کام میں لگائیں۔ میں اسے اپنی کافی عزت خیال کروں گا۔"

گاندھی جی کے صد سالہ جنم دن کی دنیا بھر میں تیاریاں

نئی دلی: مہاتما گاندھی کے صد سالہ جنم دن کی تقریبات دنیا بھر میں منائی جائیں گی ہر طرف اس کی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان تقریبات کا آغاز اس ماہ میں ۲ اکتوبر سے ہوگا اس وقت تک ۸۰ ملکوں میں قومی کمیٹیاں بن چکی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے سرپرست یا چیرمین اکثر ملکوں میں خود ان ملکوں کے سربراہ ہیں برطانیہ میں اس سلسلہ میں جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے چیرمین ہندوستان کے سابق گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہیں موصوف تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے گورنر جنرل تھے اور امریکہ میں جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے چیرمین امریکہ کے نائب صدر جناب ہیوبرٹ ہمفری ہیں۔ جرمنی میں ۲ اکتوبر کو گاندھی جی کی یاد میں ایک جلسہ ہوگا جس کی صدارت جرمنی کے وزیر اعظم جناب کیسنگر کریں گے۔ اسی دن جرمنی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا جلسہ ہوگا جس میں گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ (الجمعیۃ)

مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کے خطوط کی بازیافت

دلی: پرائیویٹ کاغذات کے دو گراں قدر ذخیرے جن میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے دو ہزار خطوط شامل ہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیچرز ٹریننگ کالج کے تہ خانے سے ملے ہیں۔ ان کو دیمک اور پھپھوندی لگی ہوئی ہے مولانا محمد علی کے کاغذات میں ان خطوط کے مسودے شامل ہیں جو مولانا نے مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز اینی بسنٹ، جناب محمد علی جناح، ڈاکٹر اقبال، جناب تیج بہادر سپرو اور بہت سے دوسرے لیڈروں کو لکھے تھے یا ان سے مولانا کو موصول ہوئے تھے مولانا محمد علی کے کاغذات میں بہت سے ایسے نایاب مخطوطے بھی ہیں جو اب کہیں دستیاب نہیں ہوں گے۔ ان کی مطبوعہ تحریروں کے مسودے اور مولانا کے ہفت روزہ انگریزی کامریڈ اور اردو روزنامہ ہمدرد کے مکمل فائل بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کے کاغذات میں گاندھی جی، علی برادران، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، جناب رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے سرکردہ لیڈروں کے نام خطوط شامل ہیں۔ یاد رہے، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری مرحوم ان لیڈروں میں سے ہیں جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ، مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر انصاری مرحوم پہلے امیر جامعہ تھے۔ دونوں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بھی رہے تھے اور دونوں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے بھی سرکردہ لیڈروں میں تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان دستاویزات اور کاغذات کی جامعہ میں موجودگی کا علم جامعہ ملیہ کے ایک لائبریرین حافظ نبی احمد صاحب کو تھا۔ ان کا چند سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ ان دستاویزات کو انھوں نے ہی دوسری کتابوں کے ساتھ تہ خانے میں رکھا تھا۔ ان میں سے کچھ دستاویزات پہلے سے جامعہ میں موجود تھیں باقی دوسری جگہوں سے فراہم کی گئیں۔ ان کے انتقال کے ساتھ ان دستاویزات کا راز بھی دفن ہوگیا۔ (الجمعیۃ)

ہندوستانی اخبارات اور رسالے خریدنے کے لیے پاکستان کے قواعد

لاہور: سرکاری حکومت کے ایک فیصلہ کے مطابق پاکستان کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو جن ہندوستانی اخباروں اور رسالوں کی ضرورت ہوگی وہ نئی دلی میں مقیم ہندوستان کے ہائی کمشنر کی معرفت خریدے جائیں گے۔ چونکہ بنکوں کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان میں لین دین بند ہے اس لیے اخباروں رسالوں اور کتابوں کی قیمت نئی دہلی کے پاکستان ہائی کمیشن کو بھیجی جائے گی۔

(الجمعیۃ)

صدر ایوان اردو (پاکستان) کو اعزاز

جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) صدر ایوان اردو کو ان کی علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی طرف سے گوئٹے میڈل، حکومت جرمنی کا سب سے بڑا اعزاز گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف میرٹ، اور پنجاب یونیورسٹی کی ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ (خواجہ حمید الدین شاہد)

محمد ایوب واقف

سید نجیب اشرف ندوی

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کی عظیم و فعال شخصیت کے ترجمان کہے جاسکتے ہیں مرحوم یکم نومبر ۱۹۰۰ء کو چاندہ ضلع صوبہ بہار شریف کے ایک گاؤں آزمورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ندوۃ العلوم لکھنؤ پہنچے جہاں علامہ شبلی نعمانی جیسے جید عالم سے براہ راست عربی پڑھی۔ ان دنوں سید سلیمان ندوی نے بھی ان کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا خیال رکھا۔ عربی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد ڈاکٹر سید محمد حسین کے مشورے سے میٹرک کا امتحان دیا اور درجۂ اول کی کامیابی حاصل کی ساتھ ہی ساتھ انھیں وظیفہ بھی ملا۔ اس کامیابی نے ان کے ذوق و شوق کو بڑھا دیا اور بڑی پابندی سے وہ نصابی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے نتیجے کے طور پر جب انھوں نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۴ء میں ایف اے اور بی اے کے امتحانات دیئے تو ان امتحانات میں بھی وہ اول آئے بی۔ اے میں انھیں گولڈ میڈل بھی ملا ۱۹۲۶ء میں انھوں نے فارسی سے ایم اے کیا ایم۔ اے میں نہ صرف یہ کہ وہ اول آئے بلکہ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا ان کی اس شاندار کامیابی پر انھیں دو سو روپے کی گراں قدر تصانیف بطور انعام پیش کی گئیں۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں ایک فیلو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ دراصل یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ دار المصنفین کے آٹھ سالہ دور قیام میں انھوں نے ادبی و تحقیقی تنقیدی و تاریخی موضوعات پر گراں قدر مقالات و مضامین تحریر کئے کلیمنٹ ہارٹ (cleament HaurZ) کی مشہور تصنیف "تاریخ ادبیات ایران" (History of Arabic literature) کا اردو ترجمہ بھی کیا جو کافی مقبول ہوا۔ اسی دوران میں انھوں نے اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط و رقعات کا مجموعہ ترتیب دیا جو "رقعات عالمگیر" کے نام سے شائع ہوا۔ اس سلسلے میں مرحوم نے ایک طویل اور مبسوط مقدمہ بھی لکھا جس میں خطوط نگاری کی تاریخ اس کی اہمیت اور عالمگیر کی خطوط نویسی کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ مقدمہ ایک تاریخی و ادبی دستاویز ہے جس کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہے گی اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی وہ لکھتے رہے جن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ دار المصنفین کے ماہوار "معارف" میں کبھی کبھار وہ تبصرے بھی لکھتے رہے ان کے بعض تبصرے تو تنقیدی نقطۂ نظر سے اتنے اہم ہیں کہ انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ موقع و محل کے اعتبار سے یہاں ان تبصروں کے نام دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اورینٹل لائبریری پٹنہ کا کیٹلاگ (catalouge of The O.P.L. Patna)

بوہار لائبریری کلکتہ کیٹلاگ (catalouge of Buhar Library calcatta)

انڈیا آفس لندن کو کیٹلاگ (catalogue of The urdu MSS India office london)

"مجاز عبد الغنی" "پنجاب میں اردو" "افغانستان اور سنٹرل ایشیا" "تاریخ نثر اردو" اور "صحافت" وغیرہ

تاریخی موضوعات پر اس زمانے میں انھوں نے جو مقالے لکھے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

"او۔پی لائبریری پٹنہ میں دیوان حافظ کا ایک شاہی نسخہ" (A royal copy of Diwani Hafizin O.P.L Patna)

"اورنگ زیب کا ہندوستان" (India of Aurangzeb)

"اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی تاریخ" (History of oriental public library Patna)

"دارا کی موت اور اس کا اعتقاد" (Dara, s Death and his faith)

"محمد قاسم کے انتقال کے اسباب" (Causes of Mohammad Quasim, s Death)

"اورنگ زیب اور مراد" (Aurangzeb and Murad)

"فدا اللہ کے خطوط" (Letter of Fada-ullah)

"اختیارات بدید" (Akhtiyarat-i-Badyid)

انھوں نے ای۔ اے ہارن (E-H Horn) کی تصنیف "برٹش ہند کی سیاسی تنظیم" (Political system of BRITISH INDIA) کا خلاصہ یونی ورسٹی کی فرمائش پر اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اردو کے عناصر خمسہ شبلی، حالی، آزاد اور نذیر احمد پر ان کے معلوماتی مضامین اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان مضامین و تصانیف کے علاوہ انھوں نے اور بہت سارے ادبی و تحقیقی مضامین لکھے جو "معارف" کے علاوہ برصغیر ہند و پاک کے دیگر متعدد رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے یہاں ان مضامین کی فہرست دی جاتی ہے۔

"بہار میں اردو" اردو اورنگ آباد "ہندوستانی ادب" ہمایوں لاہور "سوری خاندان کے عہد کا بہار" زمانہ کانپور

حسام الدین سلیم

کدھر سے

چار سو اندھیرا ہے
سوجھتا نہیں کچھ بھی
روشنی کے متوالو!
پوچھتا ہوں میں تم سے
مجھ کو اتنا جتلا دو
دن کدھر سے نکلے گا!

"تاج اور اس کے معاصر" "الناظر لکھنؤ" "ہندوستان میں صحافت" نیرنگ خیال لاہور، "خاقانی حیثیت قصیدہ گو" جامعہ دہلی، "اورنگ زیب کی ڈائری" "زمیندار لاہور" "اورنگ زیب اور اس کے بھائی" "انقلاب لاہور" "جدید اردو ادب" "ہمدرد دہلی" "اردو کی مکمل فہرست۔ ایک مشورہ" "ہمدم لکھنؤ" "بہار میں اردو کی ترویج و اشاعت کا ایک منصوبہ" "اتحاد پٹنہ" "اورنگ زیب اور اسلام کی تبلیغ" "الجمعیۃ دہلی" "ایک کہانی گھر کی زبانی" "سب رس حیدرآباد" اس کے علاوہ معارف "ہمدرد" اور نیرنگ خیال میں تقریباً دس سے زائد تصانیف پر تبصرے لکھے۔

یہاں تک ان کی زندگی کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ بمبئی آئے یہاں شروع میں وہ گجرات کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے کچھ دنوں تک پروفیسری کے فرائض انجام دینے کے بعد وہ گجرات کالج سے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری میں آئے اس کالج میں وہ صرف ایک پروفیسری نہیں تھے بلکہ وہ یہاں کے مختلف شعبوں اور انتظامی کمیٹی سے بھی منسلک تھے۔ اسمٰعیل یوسف کالج کے تعلیمی نظم و نسق کو انھوں نے بہترین بنایا ۱۹۵۳ء میں وہ یہاں سے ریٹائر ہوئے تو انجمن اسلام بمبئی کی مجلس منتظمہ نے انھیں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا آنریری ڈائرکٹر مقرر کیا۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک انھوں نے اس کام کو نیک نیتی اور خلوص سے انجام دیا۔ اس ادارہ کو کامیاب بنانے کے لئے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگادی۔ اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ ادارہ اردو زبان و ادب کی نادر و کمیاب کتابوں کا ہندوستان میں سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے ہندوستان کے گوشے گوشے سے اسکالر اور محقق یہاں آتے ہیں اور اس عظیم ادارہ سے استفادہ کرتے ہیں یہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" نکالا جاتا ہے مرحوم اس کے مدیر تھے۔ وہ ہندوستان کے بلند قامت محققین سے اس رسالہ کے لئے تحقیقی مقالات حاصل کرتے رہے اس رسالے میں خود بھی لکھتے تھے میں مرحوم کے ان چند مضامین کے نام یہاں پیش کرتا ہوں جو اس رسالے میں چھپ چکے ہیں۔

"کونکنی کے عناصر اور لہجہ"

"بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں" "اردو ریویو" "مرائی جواد" "مقالات نامشی" "نقشۂ ابو سحاق" "ایک ہندوستانی انتخاب"

ابھی حال ہی میں انھوں نے "لغات گجری" مرتب کی تھی۔ اس میں انھوں نے گجری زبان (گجری زبان گجرات اور اس کے آس پاس بولی جانے والی ایک قدیم زبان کا نام ہے جو در اصل اردو ہی کا دوسرا روپ ہے اور اسی زبان میں گجرات کے قدیم شعرا و علما و مشائخ کی تحریریں محفوظ ہیں) کی پیدائش نشو و نما ترویج و اشاعت اور اس کی لسانی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

ندوی صاحب ایک بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ کے اجتماع میں انھوں نے جن ادبی موضوعات پر سیر حاصل تقاریر کی ہیں ان کے نام اس طرح ہیں "اردو کی پیدائش" "اردو کے اصناف شاعری" "اردو کے مختلف اسکول" "اردو ادب کے جدید میلانات" "اردو ادب کا مستقبل" "حیات اقبال" "اقبال کی شاعری" "اقبال کا پیغام" "میر و داغ" "دیوان اشرف گجراتی" اور "ولی دکنی" وغیرہ

وہ ہندوستان کے مختلف علمی اداروں سے وابستہ تھے وہ بمبئی یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے ممبر تھے عثمانیہ، پونا، میسور اور مرہٹواڑہ یونیورسٹیوں میں عربی فارسی و اردو بورڈ کے بھی ممبر رہے۔ بین الاقوامی تعلیم کے ہندوستانی بورڈ سے بھی ان کا تعلق تھا۔ وہ کل ہند ہندوستانی کمیٹی کے سرگرم کارکن بھی رہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نجیب اشرف ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت کئی شخصیتیں موجود تھیں۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے محقق، انشاء پرداز، مورخ، مقرر، نقاد، معلم اور پھر ایک بہت اچھے انسان بھی تھے میری ان سے پہلی ملاقات دار المصنفین اعظم گڑھ جشن طلائی میں ہوئی لیکن اس وقت ان سے کوئی گفتگو نہ ہو سکی تھی۔ دوسری بار جب میں ان سے بمبئی میں ملا تو کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی زبان کی شیرینی ان کے خلوص اور ان کی محبت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان کی شخصیت نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں ان کا معتقد و مداح بن گیا اور میرا یہ معمول سا بن گیا تھا کہ ہر روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا ان سے مل کر میر تقی میر کی یہ رباعی بے ساختہ میرے زبان پر آجاتی تھی کہ

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے ناز جس کو کمال پر اپنے کم ہووے

ہو محو کلام تو گرد آئے عالم ہو وے جو خموش تو اک عالم ہووے

استاد محترم نے ہر طرح میری ہمت افزائی کی وہ خود موضوعات دیکر مجھ سے مضامین لکھواتے رہے اور اس سلسلے میں ضروری ہدایات اور مشورے بھی دیتے رہے ان کی صحبت میں رہ کر میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ ایک مجھ پر ہی کچھ موقوف نہیں ان کا فیض تو اس قدر عام تھا کہ جو بھی ان کے پاس آیا ذوق بھر استفادہ کیا۔ افسوس کہ ایسی کمیاب شخصیت ہم سے چھین لی گئی۔ نجیب اشرف ندوی صاحب ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو دن میں دو بجے بمبئی کے ایک نرسنگ ہوم میں اللہ کو پیارے ہو گئے

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

اسی شب تقریباً دس بجے اندھیری میں ارلا برج کے قبرستان میں جہاں ان کی اہلیہ ابدی نیند سو رہی ہیں انھیں بھی سپرد خاک کر دیا گیا۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مرحوم شبلی اسکول کے بلند پایہ مفکر تھے جدید اذہان کو بھی روشنی کے اس عظیم مینارہ سے جلا ملتی رہی اس اعتبار سے وہ قدیم و جدید کا امتزاج تھے اور ان کی موت بلاشبہ ایک ادبی روایت کی موت ہے ان کا نعم البدل ملنا ناممکنات میں ہے۔ اس لئے کہ

وہ بات کہ مکین کی گئی کہ مکین کے ساتھ

(باقی صفحہ ۷ پر)

وحید اختر

رفتار

اکثر اپنے ادب کے متعلق یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا رہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے جو ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا تخلیقی سرمایہ مغرب کے لکھنے والوں کے مقابلے میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بہت ہلکا ہوتا ہے۔ جو لوگ اردو میں بہت لکھتے ہیں وہ معیار کی سطح برقرار نہیں رکھ سکتے اور ادب کو صحافت بنا دیتے ہیں۔ کیفیت اور کمیت دونوں کا پورا حق ادا کرنا اردو کے لکھنے والوں کے لئے دشوار کیوں ہے؟ شاعروں کو لیجئے تو زندگی بھر کا سرمایہ ایک یا دو دیوان ہوتے ہیں، وہ بھی بہت مختصر سے۔ نقادوں کا بیشتر سرمایہ متفرق مضامین، مختلف موضوعوں پر لکھے گئے پرچوں، ریڈیو کی تقریروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اور ناول نویس بھی چند تخلیقات کے بعد یا تو اپنے کو دہرانے لگتے ہیں یا پھر قلم رکھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مغرب کے لکھنے والے آخر عمر تک نہیں تھکتے۔ ان کا تخلیقی سرمایہ متنوع بھی ہوتا ہے اور کمیت کے لحاظ سے بھی وسیع ہوتا ہے۔ یہ ماننے کو تو جی نہیں چاہتا کہ ہمارے یہاں صلاحیتوں، مطالعے اور مشاہدے کی کمی ہے۔ پھر اس فرق کا سبب کیا ہے؟

اس سوال کا ایک ہی جواب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اب تک ادب ہمارے یہاں کل وقتی کام (Whole Time [illegible]) نہیں بن سکا ہے۔ ہندی اور بعض دوسری زبانوں میں تو آزادی کے بعد سے یہ فضا پیدا ہو چلی ہے۔ ہندی کے بہت سے ادیب کوئی اور کام کئے بغیر محض ادب کے سہارے اچھی زندگی گزار لیتے ہیں اور اپنا پورا وقت ادب کو دے سکتے ہیں۔ اردو کا معاملہ برعکس ہے اگر آزادی سے پہلے اردو ادیب کے لئے ادب کے سہارے زندگی گزارنے کے کچھ امکانات پیدا بھی ہو چلے تھے تو آزادی کے بعد اردو پڑھنے والوں کی تقسیم اور ہندوستان میں اردو کے حلقۂ اثر کے سکڑتے جانے کے نتیجے کے طور پر یہ امکانات معدوم ہو گئے۔ ہمارے یہاں ادیب یا شاعر کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے کوئی اور کام کرنا پڑتا ہے دفتروں کی ملازمت، فلم، تجارت، مدرسی، ریڈیو یا بہت ہوا تو یونیورسٹی میں تدریس و تحقیق۔ اپنے ان کاموں سے جو وقت بچتا ہے اس کا کچھ حصہ ہی ہم ادب کو دے سکتے ہیں۔ ادب دراصل کل وقتی کام ہے اور ہمارے یہاں ادب فالتو وقت کا محض ایک مشغلہ یا ہابی ہے۔ اس میں قصور لکھنے والوں کا نہیں، وہ اپنے معاشی حالات سے بندھے ہوئے ہیں۔ زندہ رہنے اور پیٹ بھرنے کے لئے ادب سہارا بن نہیں سکتا۔ اس مقصد کے لئے کوئی اور ہی پیشہ اپنانا پڑتا ہے۔ پیشہ ورانہ فرائض اور مصروفیتوں میں سے وقت نکالنا خاصا دشوار کام ہے کیونکہ آدمی جس پیشے میں بھی ہو اس کی ذمہ داریوں کے ساتھ ترقی اور بہتری کے لئے وہاں مقابلہ بھی ایسے لوگوں سے کرنا پڑتا ہے جن کی اپنے پیشے کے علاوہ اور کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ادیب ایک طرح سے دونوں جگہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ اپنے شوق ادب کی وجہ سے وہ پیشہ ورانہ کاموں میں دوسروں سے ویسا مقابلہ نہیں کر سکتا، جو ضروری ہے اور اپنے پیشے کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ادب پر بھی اتنی توجہ صرف نہیں کر سکتا جس کی ادب میں سنجیدہ کام کرنے کے لئے ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ کہ توجہ اور ریاض کے لئے وقت بچتا نہیں۔ رواروی میں فرصت اور موڈ کے لحاظ سے کبھی کچھ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ مہینوں اور برسوں سناٹا رہتا ہے۔ زندگی سے چند لمحے چرا کر ادب کو دے دینا ہی کافی نہیں ادب پوری زندگی مانگتا ہے۔

پریم چند کے لئے ہم پڑھتے ہیں کہ وہ روز پابندی سے فرض کی طرح چند گھنٹے کسی نہ کسی ناول یا افسانے پر کام کرتے تھے۔ جوش اور اقبال کو بھی شعر کہنے کے لئے پورا وقت ملتا تھا۔ یہ اسی وقت ممکن ہوا جب ان لوگوں نے اور تمام مشاغل کو چھوڑ کر پوری طرح اپنے کو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ اس میں سے بھی پریم چند کو ذریعۂ معاش کے طور پر ہندی ادب کو اپنانا پڑا کیونکہ اردو سے ان کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے تعداد کے لحاظ سے بھی بہت لکھا ہے۔ یا پھر نیاز فتح پوری ہیں جن کے لئے ادب کل وقتی کام تھا، انھوں نے مختلف اور متنوع موضوعات پر بہت کام کیا۔ آج بھی جو لوگ لکھنے کا زیادہ کام کر رہے ہیں یہ وہ ہیں جنھیں یا تو

کرامت علی کرامت

غزل

مجھ سہے ہیں جیسے آپ میری ذات کا کرب
دراصل ہے وہی سے ساری کائنات کا کرب
نحیف جسم پہ کیا کم تھی سارے دن کی تھکن
کہ میری روح پہ چھایا ہوا ہے رات کا کرب
کیا ہے قطع تعلق اگرچہ ہر شے سے
نہ دب سکے گا مگر اس سے خواہشات کا کرب
نہ جانے ذہن کے کس حادثے کا فیض ہے یہ
کہ منکشف ہے مرے شعر سے حیات کا کرب
حیات ہے کہ ہے ٹھٹھری ہوئی چٹان کوئی
شکست میں ہے نہاں جس کی اک ممات کا کرب
سنور سنور گیا احساس کا صنم خانہ
ملا مجھے یہاں جب سے جذبات کا کرب
خلوص کہتے ہیں جس کو ہوس سے وہ مفقود
شعور میں نہ اگر ہو جمالیات کا کرب

خوش حالی کے ایسے ذرائع میسر ہیں کہ وہ معاش کی فکر سے آزاد ہیں یا پھر وہ ادیب ہیں جن کا پیشہ بھی کسی نہ کسی طرح ادب ہے۔ لیکن ایسے ادیبوں کی تعداد ناقابلِ لحاظ ہے۔ بادی النظر میں جو پیشے ادیبوں کے لئے موزوں سمجھے جاتے ہیں، اُن کا کام اس قدر میکانکی، یکساں اور بور قسم کا ہوتا ہے کہ تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آنے کے بجائے کند پڑ جاتی ہیں۔ جیسے فلم اور ریڈیو میں کام کرنے والوں کو اس طرح کی عامیانہ، سطحی اور میکانکی چیزیں لکھنی پڑتی ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کا معیار، تخلیقی سطح اور ذہن اس کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر اورجنل اور اعلیٰ معیار کی تخلیقات کے لئے ان کی صلاحیتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یونی ورسٹیوں کی ملازمت اور ادیب کے پیشے میں زیادہ بُعد نہیں۔ یہ بات صرف ایک حد تک ہی صحیح ہے وہ لوگ جو یونی ورسٹیوں کے ایسے شعبوں سے وابستہ ہیں جن کا ادب سے براہ راست تعلق نہیں اپنے مضمون کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے پر مجبور ہیں، اگر ایسا نہ کریں تو اپنے مضمون سے انصاف نہیں کر سکتے اور ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری جامعات میں تحقیق اور مطبوعہ کاموں کا ایسا محدود تصور ہے کہ سماجیات، فلسفہ، نفسیات یا سیاسیات کے کسی استاد کا ادبی کام اس کے اپنے مضمون کے کام سے بالکل غیر متعلق اور بڑی حد تک ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت میں کوئی ادیب ادب پر زیادہ توجہ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اساتذہ جو ادب کے شعبوں سے وابستہ ہیں، انھیں نسبتاً آسانی میسر ہے اس لیے کہ ان کے پیشے اور ادب میں کوئی بُعد نہیں مگر تجزیہ کیا جائے تو یہاں بھی صورت زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔

جامعات کے ادب کے شعبوں میں تخلیقی کام نہ تقرر کے وقت دیکھا جاتا ہے نہ ترقی کے وقت۔ اس کے برخلاف ہمارے صدور شعبہ کا تقلیدی میکانکی ذہن تخلیقی کام کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اگر تمام اور QUALIFICATIONS برابر ہوں تب بھی ایک شاعر یا کہانی کار یا نقاد پر ایسے شخص کو ترجیح دی جاتی ہے جس نے کسی بہت ہی محدود اور اکثر صورتوں میں انتہائی غیر اہم اور غیر ضروری موضوعات پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھا ہو۔ تخلیقی فنکار کو تدریس و تحقیق کے پیشے کی ذمہ داریوں کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ درجہ اول کی تخلیق پر تیسرے درجے کی تحقیق کو فوقیت دی جاتی ہے۔ جو صدور شعبۂ ادب تخلیقی کام کی اہمیت سے واقف ہیں وہ بھی قاعدوں اور قانونوں میں اتنے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں فضول سمجھنے کے باوجود یا انھیں توڑتے نہیں یا توڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ صدیوں کی غلامی اور پسماندگی نے ہمارے ذہن کو مجموعی طور پر بڑا جامد اور ظاہر پرست بنا دیا ہے۔ ہم قاعدے قانونوں کو ان مقاصد پر ترجیح دیتے ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ وضع کئے گئے ہیں۔ ہم روح سے زیادہ لباس کو دیکھتے ہیں، قابلیت اور صلاحیت سے زیادہ رسمی ڈگریوں اور ڈپلوموں پر توجہ کرتے ہیں۔ مطالعے کی وسعت سے زیادہ صرف ایک مسئلے یا موضوع کی تحقیق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر بلندی اور گہرائی کو ناپنے کے بجائے صرف افقی سمت میں کام کرتی ہے۔ حالانکہ یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں کہ چند امیدواروں میں سے ایسے کو انتخاب کیا جائے جس کا مطالعہ وسیع، ادب و شعر کا ذوق تربیت یافتہ اور نظر گہری ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ خود منتخب کرنے والے میں جس گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے عام طور پر اسی کا فقدان ہے اس لئے بندھے ٹکے قاعدوں پر عمل کرنے ہی میں عافیت نظر آتی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی شخص نے کسی دوسرے یا تیسرے درجے کے قدیم شاعر پر واقعی بڑا قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے تب بھی اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس کی نظر مجموعی طور پر پورے ادب کا احاطہ کرتی ہے اور اس کی ادبی بصیرت بھی قابلِ قدر ہے۔ ادب کی تدریس کے لئے محض کسی ایک شاعر یا ادیب یا موضوع پر کام کرنا بہت ہی ضمنی سی چیز ہے، لیکن ہمارے یہاں آج کل میکانکی اور بے روح، بے مقصد تحقیق کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے مقابلے میں تخلیق و تنقید کی صلاحیتوں کو بیکار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے تخلیقی فنکاروں کو جن کا ادب اور دوسرے علوم کا مطالعہ وسیع ہو اور جن میں تدریس و تنقید کی نمایاں صلاحیت ہو جامعات میں رسمی ڈگریاں رکھنے والوں پر ترجیح دی جانی چاہئے۔

مغربی جامعات میں اساتذہ کے تقرر کے لئے اس قدر میکانکی قاعدے ضروری نہیں سمجھے جاتے۔ یورپ اور امریکہ میں وہ شخص جس نے کسی بھی شعبے میں بڑا اہم اور قابلِ قدر تخلیقی کام کیا ہے، رسمی ڈگریاں رکھنے والوں سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے اور اس کے تقرر کے وقت رسمی ڈگریوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ ہالڈین کو ہندوستان آنے کے بعد یہاں کے اصولوں اور قاعدوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا کہ اگر وہ یہاں کسی بھی یونیورسٹی میں سائنس کی لیکچررشپ کے امیدوار ہوتے تو وہ بھی انھیں نہیں مل سکتی تھی کیونکہ ان کے پاس ایم۔ ایس سی کی ڈگری نہیں تھی۔ یہ مضحکہ خیز صورت اکثر ہمارے یہاں پیدا ہوتی ہے کہ ایک بڑے ادیب اور نقاد کے مقابلے میں محض رسمی ڈگریوں کی روشنی میں ایک ایسے شخص کو جس کے پاس محض ڈگریاں ہوں لیکن جس کی ادبی بصیرت اور صلاحیت دونوں مشکوک ہوتی ہیں، ترجیح دی جاتی ہے۔ ایجوکیشن کمیشن کی حالیہ سفارشات میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ادب کے شعبوں میں محض رسمی ڈگریوں پر قابلیت، صلاحیت اور تخلیقی کام کو ترجیح دی جانی چاہئے۔ لیکن یہ سفارش ہمارے بے روح اور بے مقصد نظامِ تعلیم میں مشکل ہی سے قبول کی جائے گی اور قابلِ عمل قرار پائے گی۔ اور اگر کبھی اس پر عمل بھی کیا گیا تو شاید ہمارے پورے معاشرے کے کرپشن اور اخلاقی انحطاط کی روشنی میں یہ اندیشہ غلط نہیں کہ مستحقین کے بجائے نااہلوں ہی کو اثر، رسوخ اور سفارش کے بل پر کرسیاں فراہم کی جائیں گی۔

اس صورت حال میں جبکہ تخلیقی کام کی ادب کے شعبوں میں

بھی قدر نہیں ادیب مجبور ہے کہ وہ ادب کو ایک وقتی مشغلہ اور "شوقِ فضول" ہی سمجھا رہے اور اس کے مطابق فرصت کے اوقات میں ادب سے خرچ کر لیا کرے۔

ہمارے ملک میں اردو پڑھنے والوں کا دائرہ جس تیزی سے سکڑ رہا ہے اس کی روشنی میں یہ توقع کرنا کہ کبھی ہمارے قارئین کا حلقہ اتنا بڑا ہو جائے گا کہ صرف کتابوں کی رائلٹی سے ہم مغرب کے ادیبوں کی طرح فارغ البالی کی زندگی گزار سکیں گے اور پورا وقت ادب کو دے سکیں گے ایک ایسا واہمہ ہے جس کی حقیقت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موجودہ صورت حال میں علمی زبان کی حیثیت سے اردو کے ترقی کرنے کا امکان بھی بہت ہی موہوم بلکہ معدوم ہے جب ہمارے یہاں سنجیدہ ادب پڑھنے والے ہی نہیں تو علمی موضوعات پر مضامین اور کتابیں پڑھنے والے کہاں سے پیدا ہوں گے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک اردو علم کی زبان نہیں بنتی اس کا ادب بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ یوں ہم اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اپنی زبان کے ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا مقابل سمجھ لیں لیکن ہمارا ادبی سرمایہ اور ہمارے قدیم و جدید ادیبوں کا تخلیقی کام اس خوش فہمی کو جھٹلاتا رہے گا۔ ادب کی ترقی کے لئے میرے نزدیک دو چیزیں ناگزیر ہیں، ایک تو اردو کا علمی زبان بننا مختلف علوم پر ہماری زبان میں بلند پایہ اور اعلیٰ معیار کا بامقصد تحقیقی کام ضروری ہے دوسرے ادب کو کل وقتی کام کا درجہ دینا۔ پہلی بات کے لئے ہمارے ملک کے ارباب اقتدار اور لسانی عصبیت سازگار حالات پیدا نہ کرے گی دوسری شرط اس پہلی شرط ہی کا تتمہ ہے، جب پہلی شرط کی تکمیل بعید از قیاس ہے تو دوسری کی تکمیل کے خواب دیکھنا بھی عبث ہوگا۔

نی الوقت تو یہی نظر آتا ہے کہ جب تک بھی اردو کے چند پڑھنے والے باقی ہیں ہمارا ادیب اپنی انا کی تسکین کے لئے ادب کو "شوقِ فضول" سمجھ کر اور معاش سے بے نیاز ہو کر گاہے ماہے کچھ لکھ لیا کرے گا اور بس۔ "شوقِ فضول" اوائل عمر کے جوش اور تصور پرستی میں تو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر زندگی کی تلخ حقیقتوں کے مقابلے میں زیادہ دن ساتھ نہیں دے سکتا۔ تخلیقی کام کے لئے سازگار فضا بہت ضروری ہے۔ ایسے دیوانے اب بھی مل جائیں گے جو اپنی زندگی خوشحالی اور مستقبل ہر چیز کی قربانی دے کر اور ہر طرح کا نقصان برداشت کر کے ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ ایسی مقدس دیوانگی مبارک اور مستحسن ہے۔ مگر کوئی ادب محض "دیوانگیٔ شوق" کے سہارے ہی ترقی نہیں کر سکتا اور پھر دیوانگیٔ شوق بھی کتنے دن باقی رہ سکتا ہے؟

صفحہ ۲ سے آگے

اور اب اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے

خاک اڑاتی ہے گلستاں میں صبا تیرے بغیر
چاک کرتے ہیں گل دلدار قبا تیرے بغیر

لیکن افسوس کرنے اور قبا چاک کرنے سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس خلوص اور لگن سے مرحوم اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اسی خلوص اور اسی لگن کے ساتھ ان کے مشن کو فروغ دیا جائے اور اگر ایسا کیا گیا تو یقیناً ان کی یاد باقی رہے گی۔

مراسلات

انجمن ترقی اردو آندھرا کی ادبی سرگرمیاں

"ہماری زبان" کے شمارے مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء میں جناب امین عوری دکنی کا ایک مراسلہ "مدیر ہماری زبان کے نام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ریاستی انجمنوں کو مخصوص کام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ وہ علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو میں اور اردو ادب کے شہ پاروں کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کے علاوہ ڈکشنریوں کی تیاری پر بھی توجہ دیں تین علاقائی زبانوں کو سیکھنے کے لئے قاعدے بلا تاخیر مرتب کریں۔ تجویز نہایت معقول ہے۔

اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے جو کام انجام دیا ہے وہ مختصراً حسب ذیل ہے۔

(۱) تلگو سے اردو اور اردو سے تلگو سیکھنے کے لئے قاعدے مرتب کئے جا چکے ہیں جو کئی سال سے مروج ہیں۔

(۲) ہائی اسکول کے طلبہ کے لئے اردو سے تلگو اور تلگو سے اردو میں ڈکشنریاں مرتب کرائی جا کر انھیں شائع کروایا جا چکا ہے۔

(۳) تلگو ادب کی ایک مختصر تاریخ اردو میں شائع ہو چکی ہے۔

(۴) تلگو کے نمائندہ افسانوں کا ایک مجموعہ انجمن کی ایما پر ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش نے اردو میں شائع کیا ہے۔

(۵) اس وقت انجمن کی جانب سے ایک مبسوط اردو تلگو لغت کی ترتیب کا کام انجام پا رہا ہے۔ اب تک (۱۸۰۰۰) الفاظ کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اگلے سال کے اوائل تک شاید یہ لغت طباعت کے مراحل بھی طے کرے۔

(سریواستو لاہوتی)

دوربھنگہ میں غالب صدی

آئندہ فروری میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے ساری دنیا کے ادب دوست اس کا اہتمام کر رہے ہیں دوربھنگہ میں جہاں مشاعرے موسمی بیماری بن گئے ہیں غالب صدی کا کوئی چرچا نہیں ہے انجمن ترقی اردو (ہند) علاقۂ دوربھنگہ غالب صدی کا ایک پروگرام مرتب کر رہی ہے دوربھنگہ کی انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخوں کو چاہیے کہ وہ غالب صدی منانے کا اہتمام کریں جو شاخیں اس طرف متوجہ ہوں وہ مجھ سے مراسلت کریں انجمن کی شاخوں کے علاوہ وہ ادارے بھی اس سلسلے میں انجمن کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں جو غالب صدی منانے کا عزم رکھتے ہوں

(نفیس انصاری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) دوربھنگہ)

"ہماری زبان" کے ایک مضمون کے بارے میں

میں نے ایک طویل عرصے سے "ہماری زبان" میں مطبوعہ مضامین پر کچھ لکھنا روک رکھا تھا۔ ایک بار کسی اختر صاحب انصاری کا عندیہ دریافت کرنے پر گالیاں تک وصول کر کے ارادہ ہی تھا کہ "خاموشی بہ از است" اختر صاحب انصاری نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ میں اہل زبان نہ ہونے کا اشتہار دے کر اپنے لئے ڈھال مہیا کرتا ہوں آج ۲۲ اگست ۱۹۶۸ کا "ہماری زبان" زیر مطالعہ آیا تو صفحہ ۷ کے دوسرے کالم میں عالی جناب فضل المتین صاحب کا یہ ارشاد "بہر حال اظہار خیال اور اظہار رائے کا ہر ایک کو حق و اختیار ہے" ذرا ڈھارس بندھی کہ دل کی بھڑاس نکال دوں۔ الفیں ف م صاحب نے اپنے متعلق صفحہ ۷ کے دوسرے کالم میں فرمایا ہے "ایک راسخ العقیدہ اور اردو ادب کا ایک خدمت گزار ہونے کی بنا پر مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ صولت مرحوم شاعرانہ حیثیت سے راسخ العقیدہ کی تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہیں گے۔"

مرزا صائب کا فرمان ہے:

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

قبلہ صولت ٹونکی سے مجھے بھی شناسائی کا شرف حاصل ہے اور میں کبھی ان فضل المتین صاحب کی طرح سے یہ کہنے کو تیار نہیں "وہ استغنا و خودداری کی کن اعلیٰ صفات کا مظاہرہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے عالم میں کرتے رہے"۔ بظاہر ف م صاحب زبانی میں یہ فرما گئے ہیں کہ استغنا اور خودداری باہم متعلق ہیں بصورت دیگر یہ کہنا لازم آئے گا کہ فضل المتین صاحب "چہ دہی سرایہ" سے آگاہ نہیں "آدم بر سر مطلب" عالی جناب فضل المتین صاحب نے صفحہ ۵ کے دوسرے کالم کی گیارہویں سطر میں "روح رواں" کا استعمال فرمایا ہے اس چلنے والی روح سے ف م صاحب کو کیا مقصود ہے کیونکہ درست مرکب "روح و رواں" ہے اسی کالم کی ۳۴ ویں سطر میں "بے پرواہ" کا مرکب رکھا ہے درحالیکہ صحیح لفظ "بے پروا" ہے پروا کے بعد ہائے ہوز لانا نادانی ہے پھر صفحہ ۷ کے پہلے کالم کی نویں سطر میں "دنیاوی" کا لفظ لے آئے ہیں جبکہ درست لفظ "دنیوی" ہے اور "دنیاوی" کا استعمال فصحا جائز قرار نہیں دیتے پھر اسی کالم کی ۲۹ ویں سطر میں "مولینا" بجائے "مولانا" تحریر کیا گیا ہے فضل المتین صاحب جانتے ہیں کہ مولینا یا مولائے نا مہمل الفاظ ہیں اگر عربی زبان کا تتبع ضروری تھا تو "مولٰنا" لکھ سکتے تھے "مولائے ما" فارسی ترکیب سے درست ہے مگر "مولائے نا" نہیں۔ صفحہ ۷ کے دوسرے کالم کی تیسری سطر میں "رہائش" بمعنی قیام مستعمل ہے حالانکہ جس طرح سے کہنا کا حاصل مصدر کہاوت ہے اسی طرح سے رہنا سے حاصل مصدر رہاوت (یو۔ پی) کے دیہات میں مروج ہے فارسی زبان میں رہاندن یا

ربانیوں سے حاصل مصدر ہے بمعنی چھٹکارا اور رہائی ہے اس غلط العوام مشتق کو کسی فاعل اور ادب کے لئے استعمال کرنا اچھی بات نہیں ہے پھر صفحہ ۷ کے پہلے کالم کی ۲۲ ویں سطر میں عالی جناب فضل المتین صاحب راحتجانی " نور اللہ دمرقدہ " کا مرکب واؤ معطوفہ کے ساتھ لائے ہیں جو عربی زبان سے ناآشنائی اور ادب کے ساتھ ظلم کی علامت ہے ایسا دعائیہ جملہ استعمال کرنے میں اعراب سے اغماض کرنا غلط تیر اندازی پر دال ہے اور نور اللہ کے بعد واؤ کو بطور حرف عطف رکھ دینا بے علمی کی شہادت ہے ۔ آگے چل کر صفحہ ۸ کے پہلے کالم کی دوسری سطر میں " ورثہ " بمعنی میراث رکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر شاید ناگوار خاطر نہ ہوگا کہ مرنے کے مال متروکہ کو ارث ، کہا جاتا ہے اور ورثہ بطور جمع وارث لوگوں کا مفہوم دیتا ہے مثلاً عامل کی جمع عملہ ۔ داخل کی جمع دخلہ ۔ طالب کی جمع طلبہ ۔ جاہل کی جمع جہلہ اور وارث کی جمع ورثہ ۔

اعادہ ۔ میں ایک بار پھر اعلان کرتا ہوں کہ اردو میری اکتسابی زبان ہے جس کی خدمت میں مادری زبان کی طرح سے کرنا اپنا فرض منصبی قرار دیتا ہوں ؎

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

(آغا خلش کاشمیری)
۶۱ ۔ پاٹن والا محل بمبئی ۲۷

اسلام الدین قریشی

ہماری زبان کے اداریے

(گذشتہ سے پیوستہ)

لسانی اقلیتوں کے لئے معقول تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں

حیدرآباد: مہتممان تعلیمات سہ روزہ سالانہ کانفرنس میں جو ۰۰ ستمبر کو ختم ہوئی یہ فیصلہ کیا گیا کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو تعلیم کی معقول سہولتیں بہم پہونچانے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ کانفرنس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے تیقن کے لئے لسانی اقلیتوں کے بچوں کے نام قبل از وقت درج رجسٹر کرلئے جائیں۔ اس کانفرنس میں منظورہ قرارداد جس میں مہتممان تعلیمات کے علاوہ ڈاکٹر آر نائک چودھری رکن منصوبہ بندی کمیشن اور جناب جے پی نائک مشیر تعلیم حکومت ہند نے شرکت کی تھی آج پریس کے حوالہ کی گئی۔ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ ریاست میں ایک مدرس والے مدارس کی تعداد کو مراسلاتی پروگرام کے تحت ان مدارس میں مزید اساتذہ کا انتظام کرکے گھٹا دیا جائے۔ اس وقت آندھرا پردیش میں ایک مدرس والے مدارس کی جملہ تعداد (۱۸) ہزار ہے۔ کانفرنس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ سال حال ماہ دسمبر میں وزارت تعلیم حکومت ہند کے تعاون سے ریاستی سطح پر ایک سمینار کے منعقد کرنے کا انتظام کیا جائے تاکہ ہر سطح پر معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لئے اسکیمیں مرتب کی جاسکیں۔ ایک اور فیصلہ جو اس کانفرنس میں کیا گیا وہ یہ تھا کہ کسی بھی مدرس کے تعلق سے کوئی بھی کارروائی متعلقہ مہتمم تعلیمات کے پاس چند دیوم سے زائد نہ روکی جائے اور مہتمم تعلیمات کے ہر دفتر میں ان کارروائیوں میں تاخیر کی وجوہات اور ان کی یکسوئی کی تفصیلات کے اندراج کے لئے ایک علیحدہ رجسٹر رکھا جائے اور یہ بھی تجویز کی گئی کہ نظامت کی سطح پر کسی ایک نائب ناظم کو اساتذہ کے جملہ مسائل کی یکسوئی اور جانچ پڑتال کے لئے ذمہ دار بنایا جائے جس کے پاس اساتذہ راست اپنی شکایات پہونچا سکیں اور ان کے ازالہ کے لئے شخصی طور پر ملاقات کرسکیں۔ وزیر تعلیم جناب پی وی نرسمہا راؤ نے جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی یہ تجویز پیش کی کہ اساتذہ کی فلاح و بہبود کے لئے ایک خصوصی فنڈ قائم کیا جائے جو دو لاکھ روپے کا ہو۔ اس فنڈ کا تعلق ٹیچرس ریلیف فنڈ سے نہیں ہوگا جو حکومت ہند کی اسکیم کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ (رہنمائے دکن)

اردو آرٹس کالج کی رفتار ترقی

حیدرآباد: جناب حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس ایوننگ کالج کی بموجب اس کالج میں طلبہ کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس تک پہنچ چکی ہے اردو ذریعہ تعلیم کی طرف طلبہ و طالبات کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ جناب حسینی شاہد نے بتایا کہ آئندہ سال پی یو سی میں تلگو کے نفاذ کے بعد اس کالج کی افادیت اور اہمیت میں زبردست اضافہ ہوسکتا ہے چونکہ یونیورسٹی نے اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے خواہش مندوں کے بارے میں اپنی کسی پالیسی کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس کالج میں علی گڑھ میٹرک کامیاب طلبہ و طالبات کو بھی پی یو سی میں داخلہ دیا جارہا ہے جناب حسینی شاہد نے تمام محبان اردو سے اردو آرٹس کالج کی کامیابی کے لئے تعاون کرنے کی اپیل کی اور کہا ہے کہ اس سلسلہ میں بااثر اور ممتاز شخصیتوں کی توجہ سے بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

(رہنمائے دکن)

ہٹرگنڈ ریلوے اسکول میں اردو کے ساتھ ناانصافی

ہٹرگنڈ: ملازمین ریلوے کی مسلسل نمائندگی کے باوجود ریلوے اسکول میں اردو کی جائیدادوں کی آج تک گنجائش نہیں نکالی گئی ہے جس کی وجہ اردو مادری زبان والے طلبہ کا بڑا نقصان ہورہا ہے۔ نومبر ۱۹۶۷ تک یہ مدرسہ المنٹری اسکول تھا۔ ۱۹۶۷ میں مڈل اسکول اور جون ۱۹۷۷ میں ہائی اسکول بنایا گیا لیکن کسی مرحلے پر اردو کی جائیدادوں کے لئے گنجائش نہیں نکالی گئی حالانکہ مدرسے کے قیام کے وقت ہی سے زبان اول کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس وقت مدرسہ میں (۰۹) طلبہ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اور ان سب کی تعلیم کی ذمہ داری اس استاد کے ذمہ ہے جو پرائمری کی جماعتوں کے لئے متعین ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسکول کی تمام جماعتوں کی تعلیم سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا اس لئے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مزید اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ انجمن ترقی اردو نے ملازمین ریلوے ہٹرگنڈ کے اس مطالبے کو وزارت ریلوے اور مقامی عہدہ داروں کے سامنے پیش کیا ہے۔ توقع ہے کہ جلدی

اس قدیم مطالبے کی یکسوئی ہو جائے گی۔ (ترقی اردو)

سنگا ریڈی میں انجمن کا قیام

سنگا ریڈی۔ اڈہاک کمیٹی کے زیر اہتمام انجمن ترقی اردو سنگا ریڈی کا انتخاب ہوا۔ انتخابات کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عہدہ داروں نے جلسۂ عام کو مخاطب کرتے ہوئے اردو کی جدو جہد کو جاری رکھنے کا عہد کیا۔ آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم کا بھی انتظام کرے اور ایسے جونیر کالج بھی قائم کرے جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔

(نامہ نگار)

جوگی پیٹ میں اردو پنڈت کی جائدادوں کا مطالبہ

جوگی پیٹ۔ انجمن ترقی اردو جوگی پیٹ نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر اور سکریٹری ضلع پریشد کو ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ضلع میدک کے ہر تعلقے میں ایک ہائی اسکول اور کئی مڈل اسکول ہیں لیکن ان میں سے کسی مدرسے میں اردو جونیر پنڈت کی جائداد نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی (۲۰) جائدادوں کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ انجمن کی توجہ دہانی پر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر نے ناظمِ تعلیمات سے درخواست کی ہے کہ مطلوبہ جائدادوں کے انصرام کی اجازت دی جائے۔ (ترقی اردو)

برلن میں اردو

لکھنؤ۔ برلن یونی ورسٹی میں انڈیالوجی کے لکچرر جناب عارف نقوی کے اعزاز میں ایک ادبی نشست خواجہ محمد فائق ایڈوکیٹ کے مکان پر منعقد ہوئی جس میں مشرقی برلن میں آٹھ سالہ قیام کے تاثرات بیان کرتے ہوئے، شاکر لکھنوی کے ایک سوال کے جواب میں جناب عارف نقوی نے بتایا کہ مشرقی برلن میں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شکوہ کیا کہ ان ممالک کے شعرا و ادبا جہاں بڑی تعداد میں اردو بولی جاتی ہے مشرقی برلن میں اردو کی ترویج کے بارے میں لاپروائی برت رہے ہیں جس کے باعث وہاں اردو کو وہ مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی جو اس کا حصہ ہے حالانکہ اردو نظم دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابلے میں فخر سے پیش کی جا سکتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ یہ بہترین وقت ہے کہ اردو کی بہترین نظموں اور غزلوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے اور خصوصیت سے انھوں نے جرمن زبان میں ترجمے کی اہمیت پر زور دیا۔ جناب عارف نقوی خود بھی کچھ اچھے اردو افسانوں اور نظموں کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

اس ادبی نشست میں شارب لکھنوی، ابو سعید صوفیا، تسنیم فاروقی، نشتر واجدی، سلیم عمر، ناظر خیامی، حمید طباطبائی، شان عالم، اور ناوک لکھنوی وغیرہ شامل رہے۔

(قومی آواز)

امریکہ میں اردو

علی گڑھ۔ انجمن اردوئے معلی (شعبۂ اردو) کا ایک جلسہ ۲۵ ستمبر ۶۸ء کو زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا جس میں اردو کے مشہور شاعر جناب حسن نعیم صاحب نے "امریکہ میں اردو" پر تقریر کی۔ سکریٹری نے گزشتہ جلسہ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی اس کے بعد صدر جلسہ پروفیسر سرور نے حسن نعیم صاحب کا تعارف کرایا۔ سرور صاحب نے کہا کہ حسن نعیم صاحب اگرچہ نیویارک میں ہندوستانی وزارت خارجہ کے ایک افسر کی حیثیت سے مقیم تھے لیکن انھوں نے اپنے قیام کے دوران امریکہ میں اردو تعلیم و تدریس کے مسائل سے خاص دلچسپی لی اور اردو شعر و ادب کو امریکہ میں متعارف کرانے کے کام کی ابتدا کی۔ حسن نعیم اردو کے ایک خوش گو شاعر ہیں ان کی غزلوں میں جدید ذہن کے ساتھ ساتھ کلاسکی روایات کا پاس ملتا ہے۔ اپنی تقریر میں جناب حسن نعیم نے امریکہ اور کنیڈا میں اردو کی تعلیم و تدریس اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہاں کی درسگاہوں میں اردو کو کیا مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ کی بارہ یونی ورسٹیوں میں اردو کی باضابطہ تعلیم دی جاتی ہے جن میں شکاگو، وسکانسن، برکلے، کیلی فورنیا، کولمبیا، جیسی عظیم یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں انھوں نے بتایا کہ مختلف موقعوں پر مجھے یہ احساس ہوا کہ امریکہ میں اردو شعر و ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ اگرچہ وہاں کے بیشتر لوگ زبان کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ بعض ترجموں کو سن کر یا پڑھ کر اردو کی اہمیت کا وہاں احساس پیدا ہو رہا ہے۔ نعیم صاحب نے ٹورنٹو یونی ورسٹی کا ذکر خاص طور پر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں ایک تجرباتی سہ سالہ ڈگری کورس شروع کیا گیا ہے جس میں جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ اختیاری ہیں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جو مضمون وہاں لازمی طور پر طالب علم کو لینا پڑتا ہے وہ اردو ہے جسے پاس کئے بغیر ڈگری نہیں مل سکتی ہے اس وقت وہاں ۲۰ لڑکے اور ۳۲ لڑکیاں داخل ہیں۔ ایک تجرباتی کورس کے لحاظ سے یہ تعداد خاص تسلی بخش ہے۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے جناب حسن نعیم نے کہا کہ امریکہ میں اردو کو پاکستان کی زبان سمجھا جاتا ہے

تبصرہ

شہوپیاں

سنہرے سپنے (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف: رنبیر سنگھ آمر

قیمت: تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ: نمبر ۱۰-جے۔ بی۔ ۳۱۰ سیکٹر ۲۲ ڈی

چنڈی گڑھ

سنہرے سپنے میں جو افسانے شامل ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کا زندگی کو دیکھنے کا انداز خاصا رومانی ہے۔ وہ افسانہ یا کہانی میں غیر معمولیت کو ضروری خیال کرتے ہیں اور رقت آلود مکالمات اور واقعات سے کرداروں کی جذباتی زندگی اور ٹھوس حقیقی زندگی کے ٹکراؤ اور تضاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ فن کا یہ انداز اب خاصا پرانا ہو چکا ہے۔ لیکن جب ہم محمد حسین آزاد کے اسلوب میں عبدالحلیم شرر کے تاریخی قصوں کو پھر سے زندہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ افسانے بہت زیادہ پرانے نہیں معلوم ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ زمانہ سریندر پرکاش کی تجریدیت اور تخلیقی نثر احمد ہمیش کی بھیانک حقیقت پسندی اور براج مینرا کی دل دہلا دینے والی تجدیدیت کا ہے لیکن عام لوگوں کی دلچسپی کے لئے سنہرے سپنے جیسے افسانوی مجموعوں کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس مجموعے کی ترتیب میں رنبیر صاحب نے خاص جدت سے کام لیا ہے۔ مثلاً انگریزی داں طبقہ کی خاطر مجموعہ کے نام کا انگریزی ترجمہ بھی ڈسٹ کور پر دے دیا ہے۔

صفحہ ۱ سے آگے

میں نے اور بہت سے دوسرے ہندوستانیوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ہمیں تھوڑی کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے امریکہ میں اردو کو اور زیادہ مقبول بنانے کے لئے ہم نے ترجموں کی ایک اسکیم بنائی ہے اور ایسی کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا ہے جن کے ذریعہ سے ہم اردو ادب کی اہم اصناف کو امریکیوں سے متعارف کرا سکیں۔ ان لوگوں کی اردو دوستی اور شعر و ادب سے دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے ہم نے بعض رسائل بھی نکالے۔ بعض احباب اس طرف اور زیادہ توجہ کرنے والے ہیں۔ حسن نعیم نے بتایا کہ کناڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں آٹھ ہزار سے لے کر دس ہزار تک اردو داں لوگ مل جائیں گے جن میں بیشتر ہندوستانی اور پاکستانی مہاجرین ہیں لیکن صرف کناڈا میں بھی اردو جاننے والے خاص تعداد میں ہیں صرف ۲۲

اردو گھر فنڈ

۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۶۸ء تک

نمبر شمار	نام و مقام محسن	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل و وصول	کیفیت
۱۔	جناب کبیر احمد جائسی ہیرس روڈ علی گڑھ	۵-۰۰	نقد	خود
۲۔	طلبہ سیکنڈ ایئر (۱۹) ایم۔ایم گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول پلوامہ کشمیر	۱۸-۰۰	منی آرڈر	غلام احمد دانی ہیڈ ماسٹر
۳۔	طلبہ فرسٹ ایئر (۵) ایضاً	۳۰-۰۰	"	ریاض احمد اندرابی ہیڈ ماسٹر
۴۔	جناب لالہ شانتی پرکاش امرو امرتسر	۱۰۰-۰۰	چیک	جناب برہم ناتھ دت قدوش
۵۔	جناب لالہ لال چند صاحب میرٹھ	۲۰۰-۰۰	"	"
۶۔	جناب نظام محمد صالح اجابید ترکسہ وار اچیتا منی میسور تعلیم	۵-۰۰	منی آرڈر	خود
۷۔	جناب رحمت اللہ فاروقی ادیب (علیگ)	۱۰-۰۰	"	"

میزان کل ۳۶۹-۰۰

" سابق ۴۵۲۲-۵۰

کل ۴۸۹۱-۵۰

۲۲ ٹورنٹو شہر میں ہی تقریباً ڈھائی ہزار اردو جاننے والے موجود ہیں کناڈا میں بہت بڑے پیمانے پر اردو کا کام ہو رہا ہے۔ اپنی تقریر کے دوران حسن نعیم صاحب نے بعض ایسی تقریبات کا بھی تذکرہ کیا جن میں انھوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نعیم صاحب نے بتایا کہ امریکہ میں ادب و شعر کے میدان میں تخلیقی کام کرنے والوں کا رویہ اس سے قطعاً مختلف ہے جو ہمارے ملک کے ادیبوں میں پایا جاتا ہے مثلاً امریکہ میں ادب و شعر کی تخلیق اور اس کی اشاعت بھی تجارتی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ شاعر و ادیب کو اپنی تخلیق، زندگی کے ابتدائی زمانے میں لٹریری ایجنٹوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور لٹریری ایجنٹ ادیب سے مشورے لے لیتے ہیں اور اس کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے اس سے باقاعدہ فیس لیتے ہیں۔

سرور صاحب کی فرمائش پر حسن نعیم صاحب نے اپنی منتخب غزلیں سنائیں۔ سکریٹری کے شکریہ کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

(حسن احمد نظامی سکریٹری)

مالک انجمن ترقی اردو ہند پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا